ثمینہ تبسم کی ادبی بیٹیاں۔۔۔۔۔خالد سہیل

عارف عبدالمتین کا شعر ہے ؎ معراج پر ہے کربِ گوارا دماغ کا

تخلیق ہو رہا ہے سخنور کے ہاں سخن

ثمینہ تبسم ایک سخنور ہیں۔انہوں نے بھی دماغ کا کربِ گوارا سہا ہے' دردِ زہ برداشت کیا ہے اور نظموں کو جنا ہے۔وہ نظمیں ان کی ادبی بیٹیاں ہیں۔اسی لیے وہ کہتی ہیں

میری نظمیں

کوئی ہنستی

کوئی روتی

کوئی الٹی

کوئی سیدھی

کوئی غصے سے مجھ کو گھور کر تکتی

کوئی بانہیں گلے میں ڈالتی اور لاڈیاں کرتی

یہ جو بھی ہیں

یہ جیسی ہیں

مجھے سب سے محبت ہے

یہ سب نظمیں نہیں ہیں بیٹیاں ہیں

یہ ساری میں نے جنمی ہیں

ثمینہ تبسم کی نظمیں ایک مشرقی عورت کی دکھ سکھ کی کہانیاں ہیں۔

وہ عورت

جس ماحول میں پیدا ہوئی تھی وہاں

روایتوں کی حکومت تھی

مردوں کی بادشاہت تھی

اور

عورتیں دوسرے درجے کی شہری سمجھی جاتی تھیں۔

اس نے بچپن سے نوجوانی میں قدم رکھا

شعور کی سرحد پار کی

سکول سے محبت کرنی شروع کی

تعلیم کو گلے لگانا چاہا

کاغذ اور قلم سے دوستی کرنی چاہی

تو اسے بتایا گیا

تم عورت ہو

تم تعلیم حاصل کر کے کیا کرو گی

تم کھانا پکانا

کپڑے دھونا

گھر کی صفائی کرنا سیکھو

تم نے بیوی بننا ہے، ماں بننا ہے، نانی بننا ہے

تم وکیل یا انجینیر، ڈاکٹر یا ٹیچر، شاعر یا دانشور

بننے کے خواب چھوڑ دو۔

وہ ایک لڑکی تھی

معصوم سی مشرقی لڑکی

نحیف و ناتواں لڑکی

کمزور و بزدل لڑکی

اس نے گھبرا کر، ڈر کر، پریشان ہو کر، خوفزدہ ہو کر

اپنے سخت گیر باپ اور روایتی بھائی کے حتمی فیصلوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیے

اس نے ان کی مرضی کو اپنی مرضی مان لیا

اپنی شخصیت کو زندہ درگور کر دیا

اپنے تخلیقی جوہروں کو دفنا دیا

ایک اجنبی مرد کو اپنا شوہر، اپنا مجازی خدا مان لیا

اس مشرقی مرد نے

اس روایتی شوہر نے

اس عورت کے بطن سے بچے تو پیدا کیے

لیکن اس عورت کی عزت نہ کی

اس کا احترام نہ کیا

وہ اپنے بیٹے کو شہزادہ

اپنی بیٹی کو شہزادی

تو بنانا چاہتا تھا

لیکن ان کی ماں سے کنیزوں جیسا سلوک کرتا تھا

وہ نہیں جانتا تھا

کنیزوں کے بچے شہزادے اور شہزادیاں نہیں بنتے۔

وقت گزرتا گیا

وہ لڑکی جوان ہوگئی

وہ عورت بن گئی

آخر اسے احساس ہوا کہ

وہ پابہ زنجیر ہے

بہت دلگیر ہے

یاسیت کی تصویر ہے

آخر اس کی عزتِ نفس میں جوش آیا

اس کی غیرت بیدار ہوگئی

اس نے اپنے شوہر کو خیر باد کہہ دیا

وہ مرد کی قید سے رہا ہوگئی

لیکن پھر وہ تنہا ہوگئی

نجانے کب تک

وہ تنہائی کا زہر پیتی رہی

کرب سہتی رہی

اپنے زخم چاٹتی رہی

عین ممکن تھا کہ تنہائی کا وہ زہر اسے مار ڈالتا

اور وہ بھی بہت سی اور مشرقی عورتوں کی طرح

مسکن ادویہ کھا کر

تنہائی کی چادر اوڑھ کر

ہمیشہ کی نیند سو جاتی

خودکشی کر لیتی

لیکن اس نے

تنہائی کے زہر کو امرت بنا لیا

اس نے دوبارہ کاغذ اور قلم اٹھائے

اور لکھنا شروع کر دیا

اسے اندازہ ہوا کہ اس کے اندر کی شاعرہ

سو رہی تھی مری نہیں تھی

اس نے جب لکھنا شروع کیا

تو لکھتی چلی گئی

اپنے دکھ سکھ

اوروں کے دکھ سکھ

عورتوں کے دکھ سکھ

بچوں کے دکھ سکھ

مہاجروں کے دکھ سکھ

انسانوں کے دکھ سکھ

اس نے بہت سی نظمیں لکھیں

وہی نظمیں جو اس کی ادبی بیٹیاں ہیں

اب وہ ماں بھی ہے اور شاعرہ بھی

وہ رائٹر بھی ہے ٹیچر بھی

شاعرہ بھی ہے اور دانشور بھی

اور اس کی نظمیں

مشرقی لڑکیوں کے لیے

امید کی کرن ہیں

ایک مشعلِ راہ ہیں

وہ نظمیں اس کا سچ ہیں

ایسا سچ

جو عورتوں کو آزاد و خود مختار بناتا ہے

انہیں پورا انسان بناتا ہے

اور انسانیت سے محبت کرنا سکھاتا ہے

اسی لیے وہ کہتی ہیں

ہم محبت کریں

آؤ سب روشنی کی ڈگر پر چلیں

ہم محبت کریں

ہم محبت کریں

نفرتوں کی جہنم سے ہو کے پرے

باغِ دنیا میں خوشیوں کے مالی بنیں

جگنوؤں کی طرح اپنے اندر جلیں
دوسروں کے لیے روشنی ہم بنیں
اور ہر راستے پہ سویرا کریں
ہم محبت کریں
ہم محبت کریں

جولائی ۲۰۱۴ء